محمد حنیف ندوی

غزالی کی سرگزشت انقلاب

مرحوم شیخ مراغی نے کس قدر صحیح کہا ہے کہ "جب مختلف علماء کا ذکر آتا ہے۔ تو اس سے ذہن ان خصوصیات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ جو ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ یا جن کی وجہ سے ان کو دوسروں پر امتیاز حاصل ہے۔ مثلاً جب ابن سینا اور فارابی کا نام آئے گا۔ تو ان کی فلسفیانہ اور حکیمانہ حیثیت نکھر کر قلب و ذہن کے سامنے آجائے گی۔ ابن عربی کا تذکرہ ہوگا تو اس انداز کا تاثر ابھرے گا۔ کہ کسی بلند پایہ صوفی کے حالات بیان کئے جا رہے ہیں۔ اسی طرح بخاری، مسلم، امام احمد بن حنبل کا مذکور ہوگا۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ حفظ و صدق کے اونچے پیمانوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ یا ایسے لوگوں کے حالات سے تعرض کیا جا رہا ہے۔ جو معرفت رجال میں ملکۂ راسخہ رکھتے ہیں۔ لیکن غزالی کا معاملہ اس سے جدا ہے۔ ان کا نام آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک ہی آدمی کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ بیک وقت کئی اشخاص زیر بحث ہیں۔ جن میں کا ایک ایک علم و فضل کی مستقل بالذات اقلیم کا تاجدار ہے۔"

"وہ ایک ہی وقت میں ایک ماہر اصولی بھی ہیں۔ آزاد اور جسور فقیہہ و متکلم بھی۔ اور عقیدہ اہل السنت کے ایسے پرجوش حامی و ناصر بھی کہ حجت الاسلام کا اعزاز گویا انہیں کے لئے وضع ہوا ہے۔ یہی نہیں ان کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اجتماعی اصلاح کے بارے میں بھی ان کی ژرف نگاہی مسلّم ہے۔ چنانچہ یہ اس سے بھی واقف ہیں کہ قلب و ذہن کے خطرات کی کیا نوعیت ہے۔ اور فکر و رائے میں کہاں کہاں الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں فلسفہ پر ان کی تنقید بھی لاجواب ہے۔ اور یہ خوب جانتے ہیں۔ کہ اس میں شکوک و شبہات کی مقدار کتنی ہے۔ اور استواری و معقولیت کی کمیت کس درجہ ہے۔"

"آپ اگر چاہیں تو مختصر الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ آدمی کیا ہے۔ اچھی خاصی انسائیکلوپیڈیا (موسوعہ) ہے"

لیکن کیا غزالی کی عظمت صرف ان کے علم و فضل ہی میں منحصر ہے؟ اور ان کی بزرگی محض اس بنا پر ہے کہ فقہ اور اصول فقہ میں ان کا کیا پایہ تھا۔ یا فلسفہ و علوم عقلیہ میں انھوں نے کتنی مہارت پیدا کر لی تھی؟ نہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں نظام الملک کی علم دوستی نے بغداد سے لے کر نیشا پور تک مدارس دینیہ کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ اور امام الحرمین علامہ جوینی کے فیوض تربیت سے سینکڑوں اہل علم بہرہ مند ہو کر علوم و فنون کی خدمت میں مصروف تھے۔

سلجوقیوں کا یہ عہد ایسا ساز گار اور زرّیں تھا۔ کہ اس میں قحط الرّجال کی شکایت نہیں کی جا سکتی۔

ان کی بڑائی کا راز دراصل اس میں پنہاں ہے۔ کہ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تلاشِ حقیقت میں سفر و بادیہ پیمائی کی زحمتیں برداشت کیں۔ مروّجہ علوم و فنون کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ تقالید و رسوم کو پھر سے پرکھا۔ مذاہب و فرق کی دِقّتِ نظر سے چھان بین کی۔ شک و ریب کے دروازوں پر جرأت سے دستک دی۔ اور بالآخر اس سچائی کو پا لینے میں کامیاب ہوئے۔ جس کا کھوج لگانے کے لیے اُنھوں نے مسندِ درس کو چھوڑا تھا۔ اہل و عیال سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ اور جبہ و عبا کے بجائے دلق و حصیر کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنایا تھا۔ اس زمانے میں وعظ و ارشاد کے فوائد سے کنارہ کش ہونا اور درس و تعلیم کی مسندوں کو چھوڑ کر عزلت کی راہ لینا آسان نہیں تھا۔ جب کہ اس سے حکمرانوں کے ہاں رسائی اور تقریب کے مواقع میسّر ہوتے تھے۔ دولت و ثروت نچھاور ہوتی تھی۔ اور عوام میں عقیدت و نیازمندی کی راہیں ہموار ہوتی تھیں۔ جیسا کہ اس عہد کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس دَور کی کیا خصوصیت ہے۔ کسی دَور میں بھی سوا چند اہلِ حق کے کسی کو یہ توفیق ارزانی نہیں ہوئی کہ ان عہدوں، آسائشوں اور منصب و جاہ کے اعزازات کو کسی مقصد اور نصب العین کی خاطر ترک کر دے۔ تاہم اس کی اہمیت اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جب کوئی شخص ایسے انوکھے مقصد اور نصب العین کے لیے چل کھڑا ہو جو پہلے سے متعین نہیں ہے۔ اور اس منزل کی تلاش میں طرح طرح کی صعوبتوں کو جھیلنے کا عزم صمیم کرے جس کا وجود تک سر دست مشکوک ہے۔

یعنی ایسے لوگ تو ملیں گے جنہوں نے یقین و اذعان اور ایمان و عقیدہ کی خاطر زندگی کی گراں قدر نعمتوں سے محرومی گوارا کی۔ لیکن غزالی کے سوا ایسے کتنے حضرات ہیں۔ جن کو مجرد شک و ریب نے صحرا نوردی پر اُکسایا۔ یعنی اُن کے سامنے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ کچھ بندھے ٹکے عقیدوں کی حمایت کرنا ہے۔ یا کچھ ایسے نصب العینوں کو عوام تک پہنچانا ہے جن کو یہ دل سے مانتے ہیں۔ بلکہ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ جس چیز کو اب تک مانتے چلے آئے تھے اور جن علوم و فنون اور عقائد و افکار کی تعلیم و تعلّم میں عمرِ عزیز کا ایک حصہ صرف فرمایا تھا۔ ان کی حقانیت ان کی نظروں میں مشکوک ہو گئی ہے۔ اب فقہ کی موشگافیوں سے ان کی تسکین نہیں ہوتی۔ علم الکلام کی نکتہ آفرینیاں ان کی پیاس نہیں بجھاتیں۔ تعلیمیہ کے عقائد میں ان کو کوئی چیز ایسی نہیں ملتی کہ جس سے قلب و ذہن کی خلش دُور ہو سکے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ فلسفہ کے مسلمات جن کو ابن سینا اور فارابی نے استواری بخشی تھی اپنا اعتبار کھو بیٹھے تھے۔

شک و ریب نے اس درجہ دل و دماغ پر قابو پا لیا تھا۔ کہ فکر و عقل کی کوئی قدر بھی ان کے ہاں مسلم نہیں رہی تھی۔ حتّٰی کہ محسوسات تک کی حقانیت میں انہیں شبہ تھا۔ اور اس چیز کے ماننے میں بھی انہیں تامل تھا۔ کہ حواس کے ذریعہ جو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ وہ قابلِ یقین ہیں۔ اس شبہ کے کیا اسباب تھے اس کی تفصیل انہی کی زبانی سُنیئے:۔

من این الثقة بالمحسوسات واقواها حاسة   محسوسات پر بھی کیونکر بھروسا کیا جائے جب کہ ان میں قوی تر

البصر وهي تنظر الى الظل فتراه واقفا غير متحرك وتحكم بنفي الحركة ثم بالتجربة والمشاهدة بعد ساعة تعرف انه متحرك وانه لم يتحرك دفعةً بغتةً بل على التدريج ذرةً ذرةً حتى لم تكن له حالة وقوف۔ وتنظر الى الكوكب فتراه صغيرا في مقدار دينار ثم الادلة الهندسية تدل انه اكبر من الارض في المقدار۔

(المنقذ من الضلال ص ۷۱)

حاسہ بصر ہے۔ اور اس کی یہ کیفیت ہے کہ جب یہ سایہ کو دیکھتا ہے تو سکون کی حالت میں جس میں کوئی حرکت و جنبش نہیں۔ لہذا اس کو ساکن ہی سمجھتا ہے۔ پھر تجربہ و مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سایہ تو برابر حرکت کر رہا ہے۔ ہاں اس کی حرکت دفعتاً اور اچانک نہیں ہوتی۔ بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوتی ہے۔ اور مطلق سکون تو کبھی نہیں ہوا۔ اسی طرح یہ حاسہ ستارہ کو دیکھتا ہے تو اسے یہ بہت چھوٹا نظر آتا ہے گویا ایک دینار سے زیادہ اس کا حجم نہیں۔ لیکن پھر ہندسی دلائل سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تو زمین سے بھی کہیں بڑا ہے۔

محسوسات میں شبہ کی گنجائش اس بنا پر نکل سکتی ہے۔ کہ ہر ہر حاسہ کے لئے کچھ شرائط و مناسبات ہیں۔ کہ جب تک وہ نہ پائے جائیں ان کے نتائج و مدرکات کا قطعی ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً حاسہ بصر ہی کو لیجئے کہ اس کے نتائج کی قطعیت و صحت اس پر مبنی ہے کہ وہ چیز جس کو آپ دیکھ رہے ہیں۔ کیا اس کا ہر ہر حصہ آپ کے سامنے ہے۔ کیا آپ میں اور اس میں اتنا ہی فاصلہ ہے۔ جتنا کہ صحت نتائج کے لئے درکار ہے۔ اور کیا روشنی کی کافی مقدار موجود ہے؟ اور کوئی چیز درمیان میں حائل تو نہیں ان میں اگر کوئی شرط بھی نہیں پائی جائے گی۔ تو نتائج کی صحت میں شک پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن عقلیات و ریاضیات تو بہر حال قطعی ہیں۔ دو اور دو ہمیشہ چار ہوں گے۔ اور دس کا عدد بہر آئینہ تین اور چار سے زیادہ ہی اشیاء پر مشتمل ہوگا۔ غزالی کہتے ہیں کہ میں نے جب اس حقیقت پر غور کیا تو کسی حد تک مطمئن ہونا چاہا مگر حواس نے آگے بڑھ کر اعتراض کیا۔

بم تامن ان تكون ثقتك بالعقليات كثقتك بالمحسوسات

کہ جناب! کہیں یہاں بھی اعتماد کا وہی حشر نہ ہو۔ جس کا تجربہ محسوسات میں ہوا۔

(المنقذ من الضلال ص ۷۲)

کیونکہ محسوسات کے معاملے میں یہی تو ہوا۔ کہ آپ نے حواس کے اخذ کردہ نتائج کو تسلیم کر لیا اور قابل اعتماد گردانا۔ آپ دیکھ چکے ہیں اگر تقاضائے عقل آپ کی دستگیری نہ کرتا۔ تو یہ نتائج صحیح ہی رہتے۔ لیکن اس نئے تقاضہ کی روشنی میں آپ نے مجھے جھٹلایا۔ یہاں بھی اچھی طرح دیکھ لیجئے۔ کہ کہیں کوئی اور تقاضہ اُبھر کر اس تقاضائے عقلی کی تکذیب نہ کر دے کیونکہ یہ عین ممکن ہے:۔

فلعل وراء ادراك العقل حاكما آخر اذا تجلّى كذّب العقل في حكمه

(المنقذ من الضلال ص ۷۲)

شاید ادراک عقل کے سوا کوئی اور حاکم اور تقاضہ بھی ہو۔ جو واضح ہونے پر خود عقل کے فیصلوں کو جھٹلا دے۔

غزالی شک و ریب کی ان گہرائیوں تک کیونکر پہنچے۔ جب کہ ان کی تربیت ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ ان کے والد جو ایک متدین اور صوفی آدمی تھے۔ دل میں یہ آرزو رکھتے تھے۔ کہ ان کا یہ برخوردار بڑا ہو کر دین کا مبلغ و واعظ بنے۔ چنانچہ مرتے وقت ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں انہوں نے باقاعدہ وصیت کی اور ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ پھر ان کو جو اساتذہ ملے۔ وہ بھی اپنی دینی و علمی جلالت قدر میں کم نہ تھے۔ راذکانی اور امام الحرمین کا نام کون نہیں جانتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ یہ تقلیدی عقائد پر اکتفا نہ کر سکے۔

شبہ اوّل اوّل یوں پیدا ہوا۔ کہ جب انہوں نے غور و فکر کا آغاز کیا۔ تو دیکھا کہ ان کے چاروں طرف حرب آراء اور اختلاف مذہب و ملت کا ایک طوفان بپا ہے۔ اشعری معتزلی سے دست و گریباں ہے۔ فلسفی متکلم سے برسر پیکار ہے۔ اور تعلیمیہ باستثنی فقہا اپنے اپنے گروہوں اور عصبیتوں کو حق بجانب ٹھہرانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ قدرتاً ایسے مرحلہ پر غزالی ایسے ذہین و فریس انسان کے دل میں اس خلش نے سر اٹھایا ہوگا۔ کہ یا اللہ ان میں برسر حق کون ہے؟ کس کو سچا کہیں اور کس کو جھوٹا قرار دیں۔ اور پھر جب ایک ایک پر تنقید و اعتراض کی غرض سے توجہ فرمائی ہوگی۔ تو انہیں محسوس ہوا ہوگا کہ ان سب میں کچھ کچھ خامیاں اور خلل پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف انہوں نے المنقذ کی ابتدائی سطروں ہی میں کیا ہے۔ کہ خیالات و افکار کے اس بے پناہ اختلاف ہی نے ان کو تحقیق و جستجو پر آمادہ کیا۔ یہ شبہات جو پہلے پہل مذہبی و دینی داعیہ کے تحت ابھرے۔ بالآخر اتنا پھیلے اور اتنی وسعت اختیار کی کہ فلسفہ کے تمام موضوع اس کی زد میں آ گئے۔ اس موڑ پر پہنچ کر انہوں نے قدرتاً ضرورت محسوس کی کہ کیوں نہ ایسے علم کی تلاش و جستجو میں سرگرمی دکھائی جائے۔ کہ جو بالکل قطعی اور یقینی ہو۔ یہ یاد رہے کہ قطعی اور یقینی کا معیار ان کے نزدیک یہ نہیں کہ کچھ منطقی دلائل اس کی تائید کریں یا فقہی و کلامی مقدمات سے اس کی توثیق کی جائے۔ بلکہ یقینی علم یہ اس کو کہتے ہیں جس کو پالینے کے بعد احتمال اور شک و شبہ کے بادل بالکل چھٹ جائیں۔ اور حقیقت متمثل ہو کر سامنے آ موجود ہو۔ ان کے اپنے الفاظ میں سنیئے کہ یہ کس نوع کے یقین کے متلاشی تھے۔

ینکشف فیہ المعلوم انکشافاً لا یبقی معہ ریب ولا یقارنہ امکان الغلط والوھم ولا یتسع القلب لتقدیر ذالک

(المنقذ من الضلال ص ۶۹)

اس میں معلوم اسی طرح منکشف ہو جائے۔ کہ اس کے ساتھ کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ اور نہ خطا اور لغزش کا کوئی امکان ہی اس کا مقارن ہو۔ بلکہ دل میں اس چیز کے لئے سرے سے گنجائش ہی نہ رہے۔ کہ شبہات راہ پائیں۔

ظاہر ہے کہ علم کی یہ نوعیت رسمی علوم و عقائد کے ذریعہ حاصل ہونے والی نہیں۔ کیونکہ یہاں جو کچھ ہے۔ وہ ظنی اور تقلیدی ہے۔ چنانچہ فقہ سے لے کر کلام و فلسفہ تک ہر دعوی کسی نہ کسی دلیل کا محتاج ہے۔ کسی نہ کسی برہان و قیاس کا مقتضی ہے۔ اور اس کی صحت کسی نہ کسی منطقی قضیہ پر موقوف ہے۔ دلیل و قیاس اور منطق و برہان کا یہ حال ہے۔ کہ جس چیز کا

اثبات ان سے ممکن ہے اس کی تردید بھی دشوار نہیں - ان حالات میں غزالی تحقیق حق کے لئے ان راستوں کو قطعاً پسند نہیں کر سکتے تھے - علاوہ ازیں ان کو ان جماعتوں سے یہ شکوہ بھی تھا - کہ ان کی سیرتیں اس درجہ پاکیزہ نہیں - اور ان کے دلوں میں یقین و اذعان کی وہ حرارت نہیں - جو حضیض دنیا سے اٹھا کر روح و عقبیٰ کی بلندیوں پر فائز کر دے - فقہا کی ریاکاریوں سے ان کی دنیا طلبی سے اور امراء سلاطین کے ہاں خواہش تقرب سے وہ اتنے نالاں ہیں - کہ احیاء میں ان میں ایک ایک کی تفصیل لکھی ہے - اسی طرح متکلمین اور فلاسفہ سے بھی یہ خوش گمان نہیں - لہٰذا ان کے سامنے لے دے کر دفع شک اور ازالۂ ریب کا ایک ہی قابل اعتماد طریق رہ جاتا ہے کہ وہ بجائے دلیل و استدلال کی پیچیدگیوں کے زندگی کا خود غیر جانبدارانہ تجربہ کریں اور تمام روحانی و اخلاقی اقدار کو پھر سے مشاہدہ و عرفان کی کسوٹیوں پر پرکھیں -

اس طرح ان کی توجہ تصوف کی طرف مبذول ہوئی - سب سے پہلے جس چیز نے انہیں تصوف کی طرف مائل کیا - وہ صوفیائے کرام کا زہد و عفاف تھا - اس گروہ میں انہوں نے دیکھا کہ اخلاق و تزکیہ کی سطحیں اونچی ہیں - اور زندگی بحیثیت مجموعی اس قابل ہے کہ انسان اس کی آرزو کر سکے اس جماعت میں غزالی کو دونوں قسم کی خوبیاں نظر آئیں - ایک طرف تو ان کا دامن عمل دنیا طلبی کے داغ دھبوں سے بالکل پاک تھا - اور ایسے اخلاق عالیہ سے یہ آراستہ تھے کہ جو صرف حکماء و اولیاء ہی کا حصہ ہو سکتا ہے - دوسری طرف ان کا علم ایسا صحیح ان کا عرفان ایسا آزمودہ اور انداز فکر ایسا حکیمانہ تھا - کہ اس پر بھروسہ کرنا آسان تھا - ان کے اپنے الفاظ میں ان کے بارہ میں ان کا تاثر یہ تھا :-

"سیرتهم احسن السیر وطریقهم اصوب الطرق واخلاقهم ازکی الاخلاق بل لو جمع عقل العقلاء وحکمة الحکماء وعلم الواقفین علی اسرار الشرع من العلماء لیغیروا شیئا من سیرهم واخلاقهم ویبدلوه بما هو خیر منه لم یجدوا الیه سبیلا - فان جمیع حرکاتهم وسکناتهم فی ظاهرهم وباطنهم مقتبسة من نور مشکاة النبوة - ولیس وراء نور النبوة علی وجه الارض نور یستضاء به -

مجھے محسوس ہوا کہ انہیں کی سیرت خوب تر ہے - انہیں کا راستہ دوسرے راستوں کی نسبت زیادہ سیدھا ہے اور انہیں کے اخلاق زیادہ پاکیزہ ہیں - بلکہ اگر تمام عقلاء کی عقلیں اور سب حکماء کی دانائیاں اور علماء شریعت اور واقفان دین کے علوم اکٹھا کئے جائیں تب بھی اس لائق نہ ہوں کہ ان کے اخلاق و سیرت کے مقابلہ میں کسی اخلاق و سیرت کو پیش کر سکیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تمام حرکات و سکنات مشکاۃ نبوت سے مستنیر ہیں - اور نور نبوت کے علاوہ روئے زمین پر اور کوئی نور ہے ہی نہیں جس سے روشنی حاصل ہو سکے -

ان وجوہ کے پیش نظر ان کا یہ فیصلہ تو بلاشبہ ٹھیک تھا - کہ حق اور صداقت کی تلاش میں اس گروہ کے

روحانی تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن اس میں بڑا اشکال یہ تھا کہ یہ لوگ اصحاب اقاویل اور مُصنف نہیں تھے۔ کہ اپنے احوال و مقامات کی پوری پوری تشریح کر سکیں۔ یا یہ بتا سکیں کہ مشاہدہ و استغراق اور کثرت عبادت و ذوق سے انہیں کیا حاصل ہوا۔ اور جسم و جاں نے انہیں جھیلنے، مصائب و محن برداشت کرنے اور بھوک اور پیاس کی کلفتوں سے دوچار ہونے کے بعد روح کی کن لذتوں کو پایا۔ یہ دنیا ہی دوسری ہے۔ یہاں وعظ و تصانیف سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ یہاں ہر شخص کو براہِ راست میدانِ ریاضت میں کودنا پڑتا ہے۔ اور یہ جان کتابوں کی صحبت میں نہیں بلکہ اہلِ دل کی زندہ رفاقتوں میں برسوں گزارنے پڑتے ہیں۔ اطاعات و بندگی کو معمول و عادت بنانا پڑتا ہے۔ اور ریاء و شہرت کے دواعی سے کلیۃً کنارہ کشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کر کہیں وہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ جہاں پہنچ کر استدلال و شک کی جگہ یقین و اذعان کی روشنی ابھرتی ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ اگرچہ صحیح تھا۔ لیکن اتنا آسان ہرگز نہیں تھا۔ کہ غزالی فوراً اس پر عمل پیرا ہو جاتے کیونکہ انہوں نے اب تک جو زندگی کا انداز اختیار کر رکھا تھا۔ وہ اس تصوّر سے میل نہیں کھاتا تھا۔ ان کے بیسیوں تلامذہ تھے جو استفادہ کی غرض سے صبح و شام ان کے گرد جمع رہتے۔ نظام الملک ایسے چاہنے والے امراء تھے جو درس و تدریس پر آمادہ کرتے۔ اور سینکڑوں عقیدت مند تھے جو مدح و ثنا کے پل تیار کرتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تاہل کی جکڑ بندیاں تھیں۔ جو مجبور کرتیں اور سخت رکاوٹ بنتیں۔ انہوں نے اس ساری صورت حالات کا ایمانداری سے جائزہ لیا۔ اور ایک جرأت رندانہ سے دنیا و مافیہا کو ترک کر دینے کا عزم صمیم کر لیا۔ اور حق کی تلاش و جستجو میں نکل کھڑے ہوئے۔ اس فیصلہ تک پہنچنے میں نفس نے کیا کیا فریب دیئے۔ اور کس کس طرح ان کو سمجھانے کی کوششیں کیں۔ اس کا نقشہ انہوں نے خود کھینچا ہے۔

فلم ازل اتفکر فیه مدة وانا بعد علی مقام الاختیار اصمم العزم علی الخروج من بغداد ومفارقة تلك الاحوال یوماً واحل العزم یوماً واقدم فیه رجلا واؤخر عنه اخری۔ لا تصدق لی رغبة فی طلب الآخرة بکرة الا وتحمل علیها جند الشهوة حملة فتفترها عشیة۔ فصارت شهوات الدنیا تجاذبنی بسلاسلها الی المقام ومنادی الایمان ینادی: الرحیل!! الرحیل!! فلم یبق من العمر الا قلیل وبین یدیك السفر الطویل وجمیع

میں اس معاملہ میں بڑا غور و فکر کرتا رہا۔ اور اس وقت زمام اختیار میرے ہی ہاتھ میں تھی۔ کبھی تو یہ ارادہ کرتا کہ بغداد چھوڑ دوں۔ اور ان احوال سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اور کبھی اس کو پھر فسخ کر دیتا۔ اگر ایک قدم اس طرف بڑھاتا تو دوسرا ہٹا لیتا۔ اگر طلب آخرت کی سچی تڑپ صبح کو ابھرتی تو شام کو خواہشات کا لشکر حملہ آور ہو کر اس کو دبا دیتا۔ اب یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ دنیا کی شہوات اور ان کی زنجیریں تو سفر و بادیہ پیمائی سے روکتیں اور ایمان کی منادی کرنے والا یہ آواز دیتا۔ کوچ! کوچ! کیونکہ اب عمر بہت تھوڑی ہے اور جو سفر درپیش ہے۔ وہ بہت دور کا ہے۔ اور علم و عمل کا یہ سارا ذخیرہ ریا، و وہم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا

ما انت فيه من العلم والعمل رياء وتخييل فان لم تستعد الآن للآخرة فمتى تقطع؟ فعند ذلك تنبعث الداعية وينجزم العزم على الهرب والفرار!

ثم يعود الشيطان ويقول: "هذه حال عارضة اياك ان تطاوعها فانها سريعة الزوال؟ فان اذعنت لها وتركت هذا الجاه العريض، والشان المنظوم الخالي عن التكدير والتنغيص والامن المسلم الصافي عن منازعة الخصوم ربما التفتت اليه نفسك ولا يتيسر لك المعاودة"

تو اب اگر آخرت کے لئے تیار نہ ہوا۔ تو پھر کب مستعد ہوگا۔ اور اب اگر قطع علائق پر قدرت نہ پائی۔ تو کب ان سے رستگاری حاصل کر سکے گا۔ ان خیالات کے آتے ہی ہرب و فرار کا داعیہ مضبوط ہوتا۔ اور عزم یہ طے کرتا کہ بس اب علیحدہ ہو ہی جانا بہتر ہے۔ پھر شیطان یہ کہتا کہ یہ تو عارضی کیفیت ہے۔ خبردار اس کی پیروی نہ کرنا یہ تو جلدی ہی زوال پذیر ہونے والی ہے۔ اس وقت اگر تم نے اس کے بھرے میں آکر یہ جاہ منصب چھوڑ دیا۔ اور اس ٹھاٹھ کو ترک کر دیا۔ جو تمھیں بغیر کسی اندیشہ و تکدر کے حاصل ہے۔ تو پھر یہ حاصل ہونے والا نہیں۔

غزالی اسی حیص و بیص میں تقریباً چھ ماہ تک گرفتار رہے۔ اتنے میں اس افتاد ناگہانی کا انہیں سامنا کرنا پڑا کہ یکایک زبان بند ہو گئی۔ اور اس طرح مجبوراً درس و تدریس کے مشغلوں سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس زبان بندی کا غم اتنا ہوا کہ سخت بیمار ہو گئے اور کھانا پینا یک لخت چھوٹ گیا۔ اب ہزار چاہا کہ عقیدت مندوں کو خوش کرنے کی خاطر ایک کلمہ حوصلہ افزائی کہہ دیں۔ لیکن نہ کہہ سکے۔ طبیبوں اور چارہ سازوں نے تشخیص کے بعد علاج سے مایوسی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ اس بیماری کا تعلق چونکہ قلب سے ہے۔ اس لئے دوا سے اس کا اچھا ہونا مشکل ہے۔ یوں چپ چاپ پڑے رہنے سے غور و فکر اور ارادہ و عزم کی صلاحیتوں کو جلا ملی اور وہ مشکل جو صحت کی حالت میں حل نہیں ہوئی تھی خلافِ توقع اس افتاد سے حل ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن یہ اپنے مال و دولت کو مستحقین میں تقسیم کر کے اور بچوں کے لئے کفاف و قوت کا اہتمام کر کے سچ مچ بغداد سے چل ہی پڑے۔

پہلے پہل یہ شام آئے اور قریب قریب دو سال تک یہاں رہے۔ اس کے بعد ان کی سیاحت کا باقاعدہ آغاز ہوا اس اثنا میں سوا ریاضت و مجاہدہ اور خلوت و عزلت کے ان کو اور کوئی کام نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک تزکیۂ نفس کی کٹھن منزلیں طے نہ ہو پائیں گی۔ اخلاق و سیرت میں خوشگوار تبدیلی نہ ہو گی۔ اور توجہ و التفات کی عنان پوری طرح اللہ کی طرف موڑی نہ جائے گی اور علم و اذعان کی وہ کیفیت نہ حاصل ہو سکے گی جو مقصودِ اصلی ہے۔ چنانچہ دس بارہ برس کی سخت ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد وہ سعید گھڑی آ ہی پہنچی۔ جب یہ کہہ سکے کہ اللہ نے ان کے دل کو نور سے بھر دیا اور انہوں نے ایقان و اذعان کی وہ دولت پالی۔ جس کی آرزو میں دنیا بھر کے اعزازات کو ٹھکرایا تھا۔ اس مقام پر پہنچکر

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غزالی نے فکر وخیال کی دولت میں جو اضافہ محسوس کیا - اس کی تفصیلات کیا ہیں - نفس و قلب کی کن راہوں سے انہوں نے شک وریب سے پیچھا چھڑایا - اور کس طریق سے یقین واذعان کی دولت سے مالامال ہوئے - مجاہدہ وریاضت سے قلب وذہن کے کون کون نئے ابواب کھلتے ہیں - اور عرفان واذعان کی روشنی کا ہمارے مشاہدات وتجربات سے کیا تعلق ہے ؟ یہ بات تو بہرحال سمجھ میں آتی ہے - کہ غزالی ایسا جامع علوم شخص جب دنیا کے جھمیلوں کو چھوڑ دے گا اور ریاضت وعبادت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے گا - تو اس سے ذہن وفکر کو انتہا درجے کی یکسوئی حاصل ہوگی - اور وہ اپنے غیر معمولی وجدان (Intution) کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے - اور اس کے نتیجے میں ان پر ایسے ایسے اذعانات ومعارف کی نقاب کشائی ہوگی - جو عام حالات میں نہیں ہو سکتی - لیکن کیا ایک عامی انسان بھی مجاہدہ وریاضت کی برکت سے انہیں افکار اور نتائج تک پہنچ سکتا ہے - اور اس کے ذہن پر بھی متعین اور اونچے افکار کا مرتسم ہونا اس انداز سے ممکن ہے - یہ ہے فہم طلب نکتہ !

غزالی اس قبیل کے سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے بلکہ ابن المعتز کا یہ شعر نقل کر کے کمال استغنا سے آگے بڑھ جاتے ہیں

وکان ماکان مما لست اذکرہ ... فظن خیرا ولا تسأل عن الخبر

کیونکہ ان کے نزدیک یہ ایسا عالم ہے جس کی وضاحت لسان وادب کے موضوعہ پیمانوں سے نہیں کی جا سکتی - جس طرح یہ ناممکن ہے کہ عقل وشعور کو حسیات کی اصطلاح میں بیان کیا جائے - اسی طرح یہ بھی دشوار ہے کہ وجدان اور ماوراء وجدان حقائق کو عقل وشعور کی اصطلاحوں میں ظاہر کیا جا سکے - ان کے نزدیک کائنات اور حقائق اشیاء کا دامن صرف مادیات وعقل ہی تک سمٹا ہوا نہیں ہے - بلکہ اس کے آگے بھی حقیقت ووجود کی فرمانروائی ہے - اگرچہ ایک عامی اور مادہ پرست انسان کی اس تک رسائی نہیں - احیاء میں انہوں نے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ فہم وعقل کے وہ حسی آلات جو انسان کو دیئے گئے ہیں - ان سے مقصود درک اشیاء نہیں ہے - اور نہ ان کے بس کا روگ ہی ہے کہ اعلیٰ روحانی اقدار ومعانی پر قابو پا سکیں - بلکہ سمع وبصر اور خرد وخیال ایسی محدود صلاحیتیں تو صرف اس لئے بخشی گئی ہیں - کہ ان سے یہ روزمرہ کی ضروریات کا اہتمام کر سکے - یہ جاننے کے لئے کہ کائنات کیا ہے ؟ خالق کا اس سے کیا تعلق ہے ؟ اور اس کے بندوں پر کس نوع کے اخلاقی ودینی فرائض عائد ہوتے ہیں - یا اس دنیا میں کیا حق ہے اور کیا باطل ہے - جن ادراکات کی حاجت ہے - وہ مجاہدہ وریاضت سے اس وقت حاصل ہوتے ہیں - جب قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے - اور زندگی رذائل اور ذاتی خواہشات سے رہائی حاصل کر لیتی ہے - اس بنا پر غزالی کا یہ مطالبہ بجا ہے - کہ اگر حقائق اشیاء کی جستجو مقصود ہے تو دلیل سے الگ ہو کر اس لطف سے دوچار ہو کر دیکھو اس زندگی کو آزماؤ اور اپنے فکر واعمال سے یہ ثابت کرو کہ تمہارے قلب کا آئینہ اب ایسا مجلی اور روشن ہو چکا ہے کہ عالم غیب کے انعکاسات اس پر اپنا سایہ ڈال سکتے ہیں - غزالی کا کہنا ہے کہ یہ سراسر ذوقی چیز ہے - اس لئے ان کو ذوق ہی کی وساطت سے پانا ممکن بھی ہے - ان کا یہ تجزیہ کس قدر صحیح ہے - کہ جس طرح ایک مریض کو صحت کی برکات

نہیں سمجھائی جاسکتیں۔ تاوقتیکہ وہ تندرستی کی نعمت کو پالے۔ اور جس طرح ایک بھوکا نہیں جان سکتا کہ شکم سیری میں کیا مزے ہیں۔ جب تک کہ وہ خود پیٹ بھر کے نہ کھائے۔ اور جس طرح ایک ایسا شخص جس نے شراب نہیں پی۔ نشہ و سکر کی کیفیتوں کا احاطہ نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ پی کر بدمست نہ ہوجائے۔ ٹھیک اسی طرح وہ شخص اعلیٰ ادراکات سے متمتع نہیں ہوسکتا جس نے کہ زہد و عبادت کا مزہ نہیں چکھا نفس کو رذائل سے پاک نہیں کیا۔ مجاہدہ و استغراق سے قلب و فکر کی گہرائیوں میں غوطہ زنی نہیں کی۔ اور اس ذوق سے متذوق اور اس کیفیت سے منکیف نہیں ہوا۔ جو جلب انوار کے لئے ضروری ہے۔ کوئی شخص بھی اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ جس طرح حسیات سے آگے فہم و شعور کا ایک عالم ہے۔ اسی طرح اس کے آگے ایک عالم وجدان و حدس ...... کا بھی ہے۔ اور اس کی سرحد سے ایک اور عالم ادراک کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ جسے ہم ماوراء وجدان سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر معاملہ یہاں آکر رک نہیں جاتا۔ بلکہ اس سے بھی آگے ایک عالم نبوت کا ہے۔ ان میں باہمی ربط و اتصال کی نوعیت کیا ہے۔ یہ عقدہ فی الحال لاینحل ہے۔ اور خدائے علیم و خبیر ہی خوب جانتا ہے کہ یہ عقدہ کب تک لاینحل رہے گا۔ ہمارے نزدیک اس منزل تک پہنچنے کے لئے انسان کو اس وقت تک صبر کرنا پڑے گا۔ جب تک کہ یہ خارجی فتوحات سے سیر ہو کر باطن و نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اور یہ محسوس نہیں کرتا کہ یہ بھی ایک عالم ہے۔ اور علم و فن کی تگ و دو کا ایک ہدف اور نصب العین ہے اور اس لائق ہے کہ نفس و قلب کے ان مضمرات پر یہ غور کرے۔ اور ان عجائب و حقائق پر نگاہ تحقیق ڈالے۔ جو خود اس کے اندر ہیں تصوف دراصل کچھ پہلے کی چیز ہے۔ ہمارے صلحاء اور عرفاء نے نفس و قلب کے جو تجربے کئے ہیں ان میں نقص یہ ہے کہ یہ واضح نہیں۔ اور ان کی اس طرح تحلیل بھی نہیں ہوئی کہ ان کو ذاتی میلانات یا قومی و دینی اثرات سے الگ کرکے ایک سائنٹسٹ کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ عرفان حقیقت ایسی چیز نہیں کہ جس کا خارجی ارتقاء اور علوم و فنون کی تکمیل سے کوئی لگاؤ نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس انسان کا علم جس قدر آفاق کے بارے میں زیادہ صحیح، استوار اور قابلِ اعتماد ہوگا۔ اسی نسبت سے اس کا عرفان انفس و قلوب زیادہ واضح زیادہ الفاظ و پیرایۂ بیان کی گرفت میں آنے والا اور زیادہ صاف ہوگا۔ یوں سمجھئے کہ اب وقت آلیا ہے کہ موجودہ نفسیات کی روشنی میں روحانیات میں قدم رکھے۔ اور اسی بھروسے اسی اعتماد اور بصیرت کے ساتھ باطن کی طرف تحقیق و تفحص کے قدم بڑھائے جس طرح کہ اس نے خارجی دنیا میں بڑھائے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس دور میں اگر کوئی ابوطالب کوئی حارث محاسبی اور کوئی جنید و شبلی پیدا ہو۔ تو وہ ایسا ہوگا کہ اس کی بولی عامی بھی سمجھ سکیں گے۔ اور اچھی طرح جان سکیں گے۔ کہ اس عالم دروں اور دنیائے باطن کے عجائب و خوارق کا کیا عالم ہے۔ یعنی ضرورت اس کی ہے کہ تصوف باطنی علوم و فنون (Inner Sciences) کی ایک شاخ قرار پائے۔ اور ہمارے وہ علماء جو مادیات میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ مادہ و ذرہ کی تحقیق سے فارغ ہو کر علم و حقیقت کی طرف بھی مائل ہوں۔ اور اگر یہ نہ ہو پایا۔ تو پھر غزالی تعبیر کی اس کوتاہی پر بالکل معذور ہیں۔ کہ اس عالم میں جو کچھ گزرا ہے۔ میں اس کا اظہار نہیں کرسکتا

ہاں حسنِ ظن سے کام لو اور یہ نہ پوچھو کہ کیا پایا اور کیا سمجھا ۔"

رہا یہ معاملہ کہ غزالی نے متکلمین پر کیا تنقید کی ۔ فلاسفہ میں کیا خامیاں دیکھیں ۔ اور کیونکر مروّجہ علوم و فنون سے ہٹ کر تصوف کے جادۂ عمل پر گامزن ہوئے ۔ اور کن کن مشاہدات و تاثرات سے دوچار ہوئے ۔ تو اس کی تفصیل اصل کتاب "المنقذ" کی اس تلخیص میں دیکھئے جسے ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں :-

حرفِ آغاز

تبدیلی و انقلاب کے اسباب و دواعی میرے دینی بھائی ! آپ نے دریافت فرمایا ہے ۔ کہ علوم کی غرض و غایت کیا ہے ؟ ان میں کیا اسرار پنہاں ہیں ۔ مذاہب کیا ہیں ۔ اور کن کن گہرائیوں پر مشتمل ہیں ۔ آپ نے یہ بھی فرمائش کی ہے کہ میں اس امر کو بیان کروں کہ فرق و ملل کی گوناگونی اور اضطراب و اختلافات میں سے سچائی کو میں نے کیونکر پایا ۔ اور اس راہ میں کیا کیا مشکلات برداشت کیں ۔ کس طرح حضیضِ تقلید سے نکل کر تحقیق و بصیرت کی بلندیوں کی طرف قدم بڑھائے ۔ اور ابتداءً علم الکلام سے کیا فوائد حاصل کئے پھر یہ بتاؤں کہ اہلِ تعلیم سے میں نے کیا کیا معلوم کیا ۔ جو کہ حق و صداقت کی تلاش میں محض امام معصوم کی اندھی اطاعت پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے محروم رہے ۔ آپ کی یہ خواہش بھی ہے کہ ان کے فلسفیانہ طریقوں کو جس بنا پر میں نے ناپسند کیا اس کی تفصیل بیان کروں ۔ اور پھر اس چیز کی وضاحت کروں کہ تصوف طبیعت کو کیوں بھایا ۔ اور اس اثنا میں کہ میں تحقیق و جستجو کے درپے تھا ۔ وہ کیا باتیں معلوم ہوئیں جنہیں لبابِ حق و مغزِ حق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ نیز ان اسباب و وجوہ کی نشاندہی کروں ۔ جن کی وجہ سے میں نے بغداد کو چھوڑا ، اور نشرِ علم کے مواقع سے دست کشی اختیار کی ۔ حالانکہ طلباء کا ایک ہجوم تھا جو استفادے کیلئے بے قرار تھا ۔ آپ یہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ کرنے اور تجرد و زہد کی کیفیت میں برسوں رہنے کے بعد دوبارہ نیشاپور کیوں لوٹے ؟ —— میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ میں سچی رغبت ہے اس لئے ان سب سوالات کا جواب دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق چاہتا ہوں ۔ وہی میرا پروردگار ہے ، اسی پہ بھروسہ ہے اور اسی سے التجا ہے :-

ادیان و مذاہب کی رنگارنگی تو سنو ! اللہ تعالیٰ تمہیں راہِ خوب پر عمدگی سے گامزن کرے اور حق کی پذیرائی کے لئے تمہارے دل کو نرم کر دے کہ یہ جو لوگوں میں اختلاف ادیان و مذاہب ہیں اور آئمہ میں راستے اور مسلک کی کثرت ہے ۔ یہ وہ سمندر ہے کہ اکثر اس میں غرق ہوئے ہیں اور بہت ہی کم سعادت مند ہیں ۔ جنہوں نے اس سے نجات پائی ہے ۔ تکلف یہ ہے کہ ان میں کا ہر ایک یوں سمجھتا ہے کہ وہ ناجی ہے ۔

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۔ ہر ہر گروہ اپنے اپنے افکار پر نازاں ہے ۔

اس اختلاف و بوقلمونی کی آں حضرت نے پہلے سے خبر دے رکھی ہے

ستفترق امتی ثلاثا وسبعین فرقة الناجية منها واحدة :- میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائیگی مگر ان میں کا ناجی ایک ہی ہوگا ۔ سو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس صادق بندے نے فرمایا تھا وہی وقوع میں آیا ۔ اور امت فی الواقع فرقہ بندی کا شکار ہو کر رہے گی ۔

میرے دائرہ تحقیق کی وسعتیں مَیں عنفوانِ شباب ہی سے اس بحر میں غوطہ زنی کرتا رہا۔ اور اب جب کہ سن پچاس سے متجاوز ہے۔ یہ مشغلہ برابر جاری ہے۔ میری یہ غوطہ زنی اور غور وخوض ایک بزدل اور ڈرپوک انسان کی طرح نہ تھا۔ بلکہ ایک بہادر انسان کی طرح تھا۔ جو تاریکی میں گھس کر حقیقتِ حال کا کھوج لگاتا ہے۔ مشکلات پر حملہ آور ہوتا ہے اور ذاکر دعمل کے ہر ہر بھنور میں چھلانگ لگاتا اور درِ مقصود کے حصول کیلئے کوشش کرتا ہے۔

مَیں نے ہر ہر گروہ کے عقائد کی چھان بین کی اور ہر ہر مذہب کے اسرار معلوم کرنے کی تگ و دو کی۔ تاکہ اہلِ حق اور اہلِ باطل میں خط امتیاز کھینچ سکوں اور یہ جان سکوں کہ سُنی کون ہے اور بدعتی کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔ مَیں نے نہ تو کسی باطنی کو اس کی باطنیت کا جائزہ لئے بغیر چھوڑا۔ اور نہ کسی ظاہری کو یہ جانے بغیر معاف کیا کہ اس کی ظاہریت کا حاصل کیا ہے؟۔ اسی طرح میرے ہاتھ سے نہ کوئی فلسفی ہی چھوٹا اور نہ متکلم۔ فلسفی کا فلسفہ جاننے کی کوشش کی اور متکلم کے بارہ میں یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس کا کیا مقصد ہے اور اس کی قیل و قال اور بحث وجدال کی اُموسنگ وسیع ہے۔ صوفی و عابد کو بھی پرکھا۔ تاکہ اندازہ ہوسکے کہ اس کی پاک بازی کن چیزوں میں منحصر ہے اور اس کی عبادت کے کیا ثمرات ہیں؟۔ اسی طرح میرے حلقہ تنقید میں زندیق و معطل تک آتے، مَیں یہ جاننا چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو بے دینی اور تعطل پر کس چیز نے جرأت دلائی۔

جوانی کے آغاز ہی سے تقلید کی بندشیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں درکِ حقائق کا یہ چسکا اور پیاس ابتدا ہی سے تھی اور یہ میری عادت و سرشت میں داخل تھا کہ ان باتوں پر غور کروں۔ اس کو مَیں نے کسب و اکتساب سے نہیں پایا۔ بلکہ جبلت و فطرت ہی اس انداز کی تھی کہ جو بات کہوں سوچ سمجھ کر کہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جوانی کے آغاز ہی میں تقلید کی بندشیں ڈھیلی پڑ گئیں اور عقائد موروثہ کا سحر ٹوٹتا ہوا نظر آیا۔ کیونکہ مَیں دیکھتا تھا کہ یہاں عقائد کو تحقیق کی بنا پر اختیار نہیں کیا جاتا۔ بلکہ تقلید کے داعیہ سے ایسا ہوتا ہے کہ یہودی بچے یہودیت کو پسند کرتے ہیں۔ عیسائی عیسائیت کو عزیز رکھتے ہیں۔ اور مسلمان بچوں کا نشو و نما اسلامی روایات پر ہوتا ہے۔ مَیں نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ آں حضرتؐ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ :- ہر ہر مولود فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی۔ عیسائی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔

اِس سے میرے باطن میں اس فطرتِ اصلیہ کو معلوم کرنے کی تحریک ہوئی۔ اور مَیں نے جاننا چاہا کہ یہ فطرتِ اصلیہ کیا ہے۔ اور وہ عقائد کون ہیں جو بعد میں والدین اور اساتذہ کی تقلید کی وجہ سے عارض ہوتے ہیں۔ تب میرے دل نے کہا کہ میرا مقصود حقائق اشیا کو جاننا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے عقائد و خیالات کے اس گورکھ دھندے میں حقیقت کی مقدار کس درجہ ہے۔ مگر اس سے پہلے خود علم کی ماہیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہونا چاہیئے۔

حقیقی علم کی تعریف اس پر غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ حقیقی علم وہی ہوسکتا ہے جس میں شئ معلوم نکھر کر اس طریق سے پوری وضاحت کیساتھ سامنے آموجود ہو کہ اس میں کوئی شبہ نہ رہے۔ بلکہ خطا و لغزش کا کوئی امکان ہی نہ رہے

اور نہ دل میں اس کا کوئی احتمال ہی رہے کہ یہ اذعان بھی کبھی مجروح و متاثر ہو سکتا ہے۔ حتّٰی کہ اگر کوئی شخص جو پتھر کو زرِ خالص میں بدل سکتا ہے اور لاٹھی کو معجزانہ طریق سے سانپ بنا سکتا ہے۔ وہ بھی اس اذعان کو جھٹلانا چاہتا ہے تو نہ جھٹلا سکے۔ بلکہ اس میں شک و شبہ تک نہ پیدا ہو سکے۔ میں نے اس حقیقت کو پالیا کہ مجھے جب قطعی طور پر علم ہو گیا کہ دس، تین سے زیادہ کو کہتے ہیں تو اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ چاہے کوئی شخص لاٹھی کو سانپ بنا ڈالے۔ اور میں اس اعجاز کو آنکھوں سے دیکھ بھی لوں کہ واقعی یہ ہو گیا ہے اور اس کے بعد یہ کہے کہ تین، دس سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس فعل پر مجھ کو تعجب ضرور ہوگا کہ لکڑی میں زندگی کیونکر پیدا ہو گئی لیکن یہ معجزہ میرے یقین و اذعان کی سمتوں کو نہیں بدل پائے گا۔

میں نے محسوس کیا کہ جو علم اس درجہ کا نہیں ہوگا۔ میں اس پر بھروسہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ جو علم اس نوعیت کا نہیں ہے اس میں خطا و لغزش کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا وہ قطعی و یقینی ہرگز نہیں ہو سکتا۔

مداخل سفسطہ

کیا حسیات قطعی ہیں؟ حاسہ بصر کی کرشمہ سازی علم و اذعان کے اس تصور کے بعد میں نے اپنے علوم کا جائزہ لیا۔ تو معلوم ہوا کہ نفس اس طرح کے یقین سے تہی ہے۔ ہاں حسیات و ضروریات میں البتہ قطعیت پائی جاتی ہے۔ تب اس مایوسی کے بعد حسیات و ضروریات سے اُمید و رجا کا ناطہ قائم کیا اور جی میں کہا کہ میری مشکلات کا حل ان میں ڈھونڈا جا سکے گا۔ مگر پھر مجھ کو خیال ہوا کہ اس کو اچھی طرح سے جانچ لینا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ جس طرح میں اس سے پہلے تقلیدات کو یقینی اور خطا و لغزش سے مامون خیال کرتا تھا۔ یا جیسے اکثر لوگ نظریات کو صحیح و درست مانتے ہیں۔ میرا ان پر بھروسہ کرنا بھی اسی قبیل سے ہو۔ اس خیال کے سطحِ ذہن پر ابھرتے ہی میں نے محسوسات و ضروریات کے بارہ میں چھان بین شروع کر دی۔ اور یہ دیکھنا شروع کیا کہ کہیں ان میں بھی تو شک و ریب کے امکانات نہیں ہیں؟ اس تحقیق و تطول تشکیک کا نتیجہ یہ ہوا کہ دل نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ محسوسات کو شک و شبہات سے بالاتر قرار دیا جائے۔ چنانچہ شک و ریب کے معاملہ نے بڑھ کر یہ صورت اختیار کر لی کہ کھلے بندوں اس سوال پر مجبور ہونا پڑا کہ محسوسات پر بھی کیا اعتماد ہے؟ جب کہ ان میں قوی تر حاسہ بصر ہے۔ اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ یہ جب سایہ کو دیکھتا ہے۔ تو سکون کی حالت میں جس میں کوئی حرکت و جنبش نہیں۔ لہٰذا اس کو ساکن ہی سمجھتا ہے۔ پھر تجربہ و مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سایہ تو برابر سرک اور کھسک رہا ہے۔ ہاں اس کی حرکت دفعتہً اور اچانک ظہور میں نہیں آئی۔ بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج ظہور میں آئی ہے۔ اسی طرح یہ حاسہ ستارہ کو دیکھتا ہے تو اسے یہ بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ گویا ایک دینار سے زیادہ اس کا حجم نہیں۔ لیکن پھر ہندسی دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو زمین سے بھی کہیں بڑا ہے۔ یوں محسوسات و حسیات کو قطعی قرار دینے میں اشکال پیش آیا۔ اس اشکال کا کیا جواب ہے؟ عدم اذعان کی اس کیفیت کو کیونکر دور کیا جائے۔ اور اس پیچیدگی کو کیوں کر دور کیا جائے۔ اس انداز کے سوالات لوحِ دل پر بے اختیار اُبھر آتے۔

خواب اور موجود دنیا کی حقیقتیں اس کے جواب میں دل نے قدرے تأمل کیا۔ خواب کی کیفیتوں نے اس پیچیدگی اور اُلجھن کی اور تائید بہم پہنچائی۔ جی نے کہا کیا عالمِ خواب میں تم بہت سے ایسے امور و احوال نہیں دیکھتے

اور ان سے متعلق یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ امور و احوال ثابت و برقرار رہنے والے ہیں۔ پھر جب بیدار ہوتے ہو۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام احوال و افکار وہم محض اور خیال لاطائل کی کرشمہ سازی ہے۔ جس کی کوئی حقیقت اور وجود خارج بس نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو اس پر کیوں یقین کر لیا گیا ہے۔ کہ اس عالمِ بیداری میں حس و عقل کے تمام نتائج صحیح اور درست ہی ہیں جب کہ اس بات کا امکان ہے۔ کہ اس حالت بیداری پر ایک اور حالت طاری ہو جائے جس کو آپ کی موجودہ حالتِ بیداری سے وہی نسبت ہو، جو حالت خواب کو حالت بیداری سے تھی۔ اور اس طرح معلوم ہو کہ جس کو تم عالم بیداری ٹھہراتے ہو وہ طاری ہونے والی کیفیت کے نقطۂ نظر سے عالم خواب ہے۔ جب تم اس کیفیت کو اپنے پر عاید کرلو گے تو تمہیں یقین ہو جائیگا کہ تمہاری عقل نے جن جن امور کی قطعیت کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ سب باطل اور واہمہ کی تخلیق ہے۔ ممکن ہے صوفیائے کرام جس حالت و کیفیت کا تذکرہ کرتے ہیں وہ اسی ڈھب کی ہو۔ کیوں کہ ان کا یہ گمان ہے کہ جب وہ اپنے حواس سے الگ ہو کر نفس و باطن میں غوطہ زنی کرتے ہیں تو ان کو ایسے ایسے احوال و امور سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن کی معقولات سے کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کیفیت کو موت سے تعبیر کیا جائے۔ جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے۔

النّاس نیام فاذا ماتوا انتبہوا۔ لوگ اس دنیا میں سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تب جاگیں گے۔

اس لحاظ سے دنیا کی یہ زندگی، آخرت کی نسبت سے نوم اور نیند ہوئی۔ چنانچہ جب عقبیٰ میں انسان کی آنکھ کھلے گی۔ تو وہاں یہ ایسی چیزیں دیکھے گا۔ جن کی دنیا کے مشاہدات سے تصدیق نہیں ہو سکتی۔

فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید۔ ہم نے پردوں کو تم پر سے ہٹا دیا۔ سو آج تمہاری نظر تیز ہے۔

جب اس طرح کے اندیشے دل میں ابھرے۔ اور اس انداز کے جذبات شکوک و شبہات کا باعث بنے۔ تو میں نے ہر چند چاہا کہ اس بیماری کا علاج کر دوں۔ لیکن یہ نہ ہو سکا۔ کیوں کہ اس بیماری کا علاج تو دلائل ہی سے ممکن ہے۔ اور دلیل اسی پر موقوف ہے۔ کہ اولیات سے مرکب ہو۔ مگر اولیات جب اعتبار کھو بیٹھے تو دلیل قائم کرنا اور ثبوت مہیا کرنا سخت دشوار ہو گیا۔ لہٰذا میں قریب قریب دو ماہ اس سوفسطائیانہ تشکیک میں الجھا رہا۔

لیکن یہ تشکیک ذہن کی ایک کیفیت اور قلب کے
یہ تشکیک حال کے اعتبار سے تھی، مقال کے اعتبار سے نہیں ایک اضطراب سے تعبیر تھی۔ نطق و مقال میں اس کا اعتبار نہیں ہوا تھا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس گمراہی سے نکالا اور پوری پوری شفا بخشی۔ اب نفس نے صحت و اعتدال کی نعمت کو دوبارہ حاصل کیا۔ اور وہ ضروریات عقلیہ جو اس سے پہلے یقین و اذعان سے یکسر تہی ہو چکے تھے۔ اب دوبارہ اس لائق ہوئے کہ ان پر اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکے۔ ضروریاتِ عقلیہ میں یہ یقین آفرینی اس طریق سے پیدا نہیں ہوئی کہ اس میں دلائل کے نظم و ترتیب کو کوئی دخل ہو۔ بلکہ ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دل کو اپنے مخصوص نور سے روشن کیا۔ اور شک و ریب کی تاریکیاں اس سے دور ہوتیں۔ اور درحقیقت یہ نور ہی ہے جس سے اکثر معارف و اسرار کی عقدہ کشائی

ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کشف و نور کی یہ کیفیت دلائل محررہ کی رہین منت ہے۔ انہوں نے گویا اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمتوں کو تنگ اور محصور کر دیا۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا کہ آنحضرت سے جب اس آیت کے معنیٰ پوچھے گئے، تو فرمایا فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ——— وہ ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتا ہے"۔ اس پر سوال کیا گیا۔

اس کی کیا علامت ہے؟۔ فرمایا

اس دنیا سے روگرداں ہونا جو دار الغرور ہے۔ اور دار عقبیٰ و آخرت کی رجوع ہونا۔ جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ہے اور یہی مقصد ہے۔ اس حدیث کا

ان اللہ تعالیٰ خلق الخلق فی ظلمۃ۔ ثم رش علیھم من نورہ۔ اللہ سبحانہٗ نے اپنی مخلوق کو پہلے ظلمت میں پیدا کیا۔ پھر اس پر نور چھڑکا۔

طالب حق کو چاہیئے کہ اسی نور سے اپنے کشف کو طلب کرے۔ اور دلائل و براہین کا منت پذیر نہ رہے۔ یہ یاد رہے کہ کسب انوار کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے جود و کرم کا چشمہ کچھ ساعتوں میں چھلکتا رہتا ہے اور یہ نور اور یہ نور اس چشمہ فیض سے ان لمحوں میں نکلتا رہتا ہے۔ اس لئے جیسا کہ آں حضرت کا ارشاد ہے۔ ان اوقات میں اس کا منتظر رہنا چاہیئے

ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات الا فتعرضوا لھا تمہاری زندگی کی ساعتوں میں، تمہارے پروردگار کی لپٹیں ہیں تم ان کے درپے رہو

اس وضاحت سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری طلب و جستجو مرتبہ کمال تک پہنچ جائے۔ اور تم ان حقائق کے لئے اپنے میں تشنگی و طلب محسوس کرو۔ جن تک طلب و تفحص کی دسترس نہیں۔ کیوں کہ جہاں تک اولیات کا تعلق ہے وہ تو تمہاری طلب و تحقیق کا ہدف بننے سے رہے۔۔۔ کہ وہ پہلے سے موجود اور حاضر ہیں۔ (اور حاضر و موجود کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے بارہ میں جس قدر طلب و تحقیق کے قدم بڑھاؤ گے، ان میں اتنا ہی بعد و اختفاء پیدا ہوگا) لہٰذا طلب کیلئے ہر بہر گرایک ہی میدان رہ جاتا ہے۔ اور وہ ہے۔ مالا یطلب حقائق کا اس میں مزید فائدہ یہ مضمر ہے۔ کہ جو مالا یطلب کی طرف متوجہ ہوگا۔ اس پر مایطلب کی طلب و جستجو میں کوتاہی کا الزام نہیں لگایا جائے گا۔